Open Access

Al-Irfan *(Research Journal of Islamic Studies)*

Published by: *Faculty of Islamic Studies & Shariah*
Minhaj University Lahore
ISSN: *2518-9794 (Print), 2788-4066 (Online)*
Volume 11, Issue 21, Jan-June 2026,
Email: alirfan@mul.edu.pk

العرفان

پاکستان میں نوجوانوں میں بڑھتے ہوئے سیکولر رجحانات: اسباب، مظاہر اور سماجی اثرات

The Rise of Secular Tendencies Among Pakistani Youth: Causes, Manifestations, and Social Impacts

Khushhall Shaheen
PhD Research Scholar, Superior University Lahore
mphil2017itc@gmail.com
Dr. Neelum Bano
Assistant Professor Superior University Lahore
neelam.bano@superior.edu.pk

ABSTRACT

This study examines the growing secular and atheistic trends among youth in Pakistan from a socio-ideological perspective. It argues that these trends represent a deep structural and cultural challenge extending beyond elite circles into the broader middle class through digital media and social networks. The research identifies three primary causes: the state's failure to implement Islam as a comprehensive system of life, the lack of effective ideological education in academic institutions, and the inability of traditional religious leadership to address contemporary social and economic issues. The study finds that these developments threaten family values, moral norms, and the religious identity of young people. To address this challenge, it recommends establishing an intellectual think tank to counter secular narratives, launching digital media initiatives to engage youth, strengthening collaboration between universities and religious seminaries, and revitalizing mosques as community centers that provide intellectual, social, and spiritual guidance. These measures aim to reconnect youth with their religious and cultural identity.

Keywords:

Secular Trends, Intellectual Atheism, Educational System, Social Impacts.

عصرِ حاضر میں مسلم معاشروں کی طرح پاکستان میں بھی سیکولرازم محض ایک نظریاتی بحث تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ سماجی اور فکری سطح پر ایک واضح کشمکش کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ماضی میں جسے بنیادی طور پر بالائی سماجی طبقے (Elite Class)سے منسوب کیا جاتا تھا، اب وہ مختلف عوامل کے باعث عمومی معاشرتی طبقات، بالخصوص نئی نسل کے فکری رجحانات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

تصوراتی اور فکری بنیادوں پر دیکھا جائے تو اسلام اور سیکولرازم دو بالکل متبادل اور متصادم طرزِ حیات پیش کرتے ہیں۔ اسلام اپنے پیروکاروں سے زندگی کے تمام انفرادی، اجتماعی اور ریاستی امور میں الہامی اصولوں کی غیر مشروط پیروی کا تقاضا کرتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی نصِ صریح ہے" :ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً (1)(اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ)۔اس کے برعکس، سیکولرازم کی لغوی اور اصطلاحی اساس اجتماعی و سیاسی زندگی سے مذہب کی بید خلی یا اسے محض انفرادی سطح تک محدود کرنے پر استوار ہے۔(2)

تاریخی تناظر میں، مغربی دنیا اور بعد ازاں مسلم معاشروں میں اس فکر کو ابتداً رواداری(Tolerance) ، برداشت اور تکثیریت (Pluralism) کے بیانیے کے ساتھ متعارف کرایا گیا تھا۔ تاہم، معاصر عالمی اور علاقائی منظر نامے میں اس بیانیے کے تضادات واضح ہو رہے ہیں۔ ایک طرف مغربی ممالک میں حجاب، اسکارف اور شعائرِ اسلام پر قانونی پابندیاں لبرل غیر جانبداری کے دعووں کو چیلنج کرتی ہیں، تو دوسری طرف خود پاکستان کے اندر اس فکر کے حامل طبقات روایتی مسلم اقدار اور دینی ڈھانچے پر تنقید کا دائرہ وسیع کر رہے ہیں۔

رواداری کا یہ یکطرفہ مطالعہ اور فکری تبدیلی کا یہ رجحان ایک ایسے معروضی ماحول میں جنم لے رہا ہے جہاں کی ۹۶ فیصد سے زائد آبادی مسلم ہے،اور 'پیو ریسرچ سینٹر (Pew Research Center) 'کے شماریاتی اعداد و شمار کے مطابق، ۸۴ فیصد پاکستانی سماج میں اسلامی شریعت کے نفاذ اور اس کی بالادستی کے حامی ہیں۔ یہی تضاد اس موضوع کے گہرے علمی، اسبابی اور سماجی تجزیے کا متقاضی ہے۔(3)

پاکستان میں تاریخی طور پر سیکولر افکار کے حامی عددی اعتبار سے اقلیت میں رہے ہیں، تاہم ریاستی و انتظامی ڈھانچے اور قومی ابلاغی ذرائع (Media Sources) پر اثر ورسوخ کے باعث یہ طبقہ روایتی دینی تصورات پر تنقید میں نمایاں رہا ہے۔ شعائرِ اسلام، خاندانی نظام کے مذہبی ضوابط، امت کا اسلامی تصور، ملی تشخص، معاشی نظام میں حرمتِ سود کا مسئلہ، اور سیاسی و عوامی مناصب کے لیے امانت و دیانت کے معیار—ان تمام محاذوں پر پاکستانی معاشرے میں سیکولر افکار کے داعی گہرے فکری و علمی اثرات مرتب کرنے کے لیے متحرک نظر آتے ہیں۔ یہ طبقہ تعلیمی و سماجی اداروں، سوشل میڈیا، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اپنے بیانیے کی ترویج میں مسلسل سرگرم ہے۔ پاکستان کی انگریزی صحافت روایتی طور پر اس فکر کی ترجمانی کے لیے جانی جاتی ہے، جہاں عصرِ حاضر میں بھی سیکولرازم کے فروغ اور اس کی

اطلاقی صورتوں پر کھل کر بحث کی جاتی ہے۔ انگریزی صحافت میں شائع ہونے والے ایسے فکری مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے ان نظریات کے متبعین اکثر یہ تجویز دیتے ہیں کہ

This should be translated into Urdu for the masses so that the wider public can understand and engage with its ideas. (4)

موجودہ فکری منظر نامے میں یہ رجحان صرف انگریزی صحافت تک محدود نہیں رہا، بلکہ معاصر اردو صحافت کا ایک نمایاں حصہ بھی اسی فکری رخ کی عکاسی کر رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اس متبادل بیانیے میں اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قومی ترقی اور جدیدیت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ریاستی و انتظامی امور میں سیکولر اصولوں کا جامع نفاذ ناگزیر ہے، اور اب تک کے نیم سیکولر یا متبادل انتظامات مطلوبہ نتائج فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

چونکہ نئی نسل کا بڑا حصہ اپنا وقت جدید تعلیمی اداروں اور ڈیجیٹل یا روایتی میڈیا کے سائے میں گزارتا ہے، اس لیے ان دونوں اداروں کے فکری اثرات نوجوانوں کی ذہن سازی میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ نوجوان نسل، جو مستقبل میں ملکی نظم و نسق سنبھالنے کی ذمہ دار ہے، ایک گہرے نظریاتی تغیر سے گزر رہی ہے۔ پاکستان کی تاریخی بنیادیں جس نظریاتی اور تاریخی پس منظر (نظریہ پاکستان) پر استوار تھیں، اور جس کے لیے وسیع پیمانے پر جانی و مالی قربانیاں دی گئیں، نئی نسل میں اس تاریخی شعور اور نظریاتی وابستگی کی کمی کے حوالے سے سنجیدہ فکری سوالات جنم لے رہے ہیں۔ یہ خدشہ اکیڈمک حلقوں میں زیرِ بحث ہے کہ ریاست کے بنیادی بیانیے اور اس کی تاریخی اساس سے دوری، طویل المیعاد بنیادوں پر ملکی مقاصد کے حصول اور قومی یکجہتی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

اگرچہ اس وقت پاکستانی نوجوانوں میں سیکولر افکار کے زیرِ اثر آنے والے افراد کی قطعی تعداد کو درست شماریاتی اعداد و شمار (statistical data) کی صورت میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے، تاہم اعلیٰ تعلیمی اداروں کے تدریسی و تحقیقی ماحول میں نوجوان طلبہ و طالبات سے براہِ راست وابستہ ماہرین اس فکری تبدیلی اور رجحانی تبدیلی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ تعلیمی مباحث اور نصابی مواد میں عالمی سطح پر پالیسی اثرات کے نتیجے میں فکری تنوع اور بعض اوقات سیکولر رجحانات کے فروغ کی نشاندہی مختلف تعلیمی مطالعات میں کی گئی ہے۔ (5)

روایتی اسلامی معاشرتی اقدار، مسلمہ امور اور مروجہ دینی تصورات پر علمی سوالات اور مباحث کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ عقائد اور مذہبی تعلیمات کے حوالے سے تشکیک پسندی (Skepticism) کے رجحان میں اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔ فکری اور فلسفیانہ اصولوں کے مطابق، تشکیک پسندی دراصل سیکولر فکر کی ترویج کا ابتدائی مرحلہ اور علمی بنیاد ثابت ہوتی ہے، جو مروجہ مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) اور روایتی بیانیوں پر سوال اٹھا کر نئے فکری دھاروں کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔

The theory of skepticism holds that certain knowledge is impossible or that human beings cannot attain absolute certainty in knowledge. It emphasizes the limitations of human perception and reasoning, suggesting that all claims to knowledge should be approached with doubt and critical examination. This philosophical stance has played a significant role in shaping modern epistemological debates, particularly in relation to the nature and scope of human understanding(6)

مروجہ مذہبی اصولوں اور روایتی سماجی اقدار سے دوری کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر اخلاقی و نفسیاتی مسائل میں مسلسل اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔ طبّی ماہرین، بالخصوص خواتین کے امراض کی ماہرین (Gynecologists) اور نفسیاتی معالجین (Psychologists) کے مشاہدات اس ضمن میں اہم اشارے فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، لاہور کے ایک نامور سرکاری ہسپتال میں گزشتہ اٹھائیس برسوں سے وابستہ ایک خاتون ماہرِ نفسیات نے ایک علمی سیمینار کے دوران یہ تشویشناک مشاہدہ سائنسی بنیادوں پر پیش کیا کہ شہری مراکز کے مہنگے اور معروف نجی و سرکاری تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم طلبہ و طالبات میں اخلاقی الجھنیں، نفسیاتی امراض، منشیات کا بڑھتا ہوا استعمال اور اقدامِ خودکشی (Suicide attempts) جیسے رجحانات زیادہ شرح کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ مروجہ فکری رویوں اور روایتی اقدار سے دوری کے یہ اثرات ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں، جو مستقبل میں مزید گہرے سماجی بحران کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

معاشرتی سطح پر ان فکری و نفسیاتی تبدیلیوں کا رونما ہونا کسی وقتی یا ناگہانی واقعے کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے پیچھے پاکستان کی چند دہائیوں پر محیط طویل فکری و سیاسی تاریخ اور اس میں ہونے والی سٹرکچرل (ساختی) غلطیاں کارفرما ہیں۔ اگرچہ اس محدود مطالعے میں ان تمام تاریخی و سماجی اسباب کا کماحقہ احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، تاہم نوجوان نسل میں بڑھتے ہوئے ان سیکولر رجحانات کے فکری محرکات کو سمجھنے کے لیے تین بنیادی اور کلیدی اسباب پر تفصیلی معروضات اگلی سطور میں پیش کی جا رہی ہیں۔

پاکستانی سیاست کا سیکولرزم کے فروغ میں کردار:

پاکستان کا قیام تاریخی اعتبار سے اس لحاظ سے منفرد تھا کہ اس ریاست کی تشکیلی تحریک کے دوران قائدین اور علمی اشرافیہ کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس کے ذہنوں میں بھی تحریک کے بنیادی مقاصد اور نظریاتی اہداف پوری طرح واضح تھے۔ تحریکِ پاکستان کے مورخین کے مروجہ مآخذ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کی صدیوں پر محیط علمی، فکری اور عملی کاوشیں اس ریاست کے قیام کی جدوجہد کا تاریخی تسلسل تھیں۔آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۰۶ء میں قیام کے بعد سے، تحریک کے کلیدی قائدین اس بیانیے پر یکسو تھے کہ اس نئی مملکت کا اساسی مقصد اسلامی اصولوں کا احیاء ہوگا۔اس فکری یکسوئی کا اظہار علامہ محمد اقبالؒ کے خطبات سے بھی ہوتا ہے، جنہوں نے واضح طور پر یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اسلام کو محض ایک انفرادی اخلاقی اصول یا محدود مذہبی تخیل کے طور پر تو باقی رکھیں، لیکن نظامِ سیاست، عمرانیات اور دیگر قومی شعبہ ہائے زندگی میں اس کی حاکمیت کو مسترد کردیں۔(7)

تاریخی شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصے میں اپنی نووے(۹۰) سے زائد تقاریر اور بیانات میں مسلم عوام کو یہ یقین دہانی کروائی کہ مجوزہ ریاست کی اساس اسلامی اصولوں پر استوار ہوگی۔اسی فکری تسلسل میں، آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے کراچی کے سالانہ اجلاس میں ایک 'پلاننگ کمیٹی ' (Planning Committee) تشکیل دی گئی، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ مستقبل کی مسلم ریاست کے لیے خالص اسلامی نقطہ نظر سے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی نظامِ عمل مرتب کرے۔(8)

۱۹۴۴ء میں قائداعظم نے تحریکِ پاکستان میں سرگرمِ عمل 'مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن' کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے اس فکری عزم کا اعادہ کیا کہ پاکستان ایک ایسی مسلم ریاست کے طور پر ابھرے گا جو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کا ذریعہ بنے گی۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائداعظم نے مختلف مواقع پر پاکستانی مسلمانوں کی انھی قومی اور نظریاتی امنگوں کی ترجمانی جاری رکھی۔ ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج، پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے صراحت کی کہ پاکستان کا مطالبہ محض زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ برصغیر کے مسلمان ایک ایسی فکری و عملی تجربہ گاہ (Laboratory) حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں وہ اسلام کے آفاقی اصولوں کو نافذ کرکے آزما سکیں۔بعدازاں، جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے تاریخی افتتاح کے موقع پر قائداعظم نے اس اکیڈمک اور معاشی خواہش کا اظہار کیا کہ بینک کا شعبہِ تحقیق (Research Division) ایک ایسا مثالی معاشی نظام مرتب کرکے دنیا کے سامنے پیش کرے جو سچے اسلامی تصورات اور سماجی انصاف پر قائم ہو، تاکہ مغرب کے مروجہ معاشی نظام کے پیداکردہ مسائل کا متبادل فراہم کیا جاسکے۔(9)

تاریخی شواہد اور بیانات کی روشنی میں اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ قیامِ پاکستان کے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی مقاصد کے لیے ایک واضح نظریاتی فریم ورک موجود تھا۔ تاہم، قیامِ پاکستان کے بعد مسندِ اقتدار پر متمکن ہونے والی متبادل سیاسی قیادتوں کی اکثریت کی ترجیحات میں ان مقاصد کا حصول اور مروجہ ریاستی قوانین کو اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھالنا بنیادی طور پر شامل نہیں رہا۔ اکیڈمک اور سیاسی تناظر میں یہ مقتدر طبقات بعض اوقات دینی احکام کی روح سے ناواقفیت یا ان کے نفاذ سے گریز کی پالیسی پر گامزن رہے، جس کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر اخلاقی تضادات اور منکرات کو بالواسطہ یا بلاواسطہ شہ ملی۔

اگر اسلامی سیاسی فکر کا گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ روایتی اسلامی نظام میں سیاسی مناصب بنیادی طور پر دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کا تسلسل ہیں، جہاں سیاسی نظم و نسق کا بنیادی نقطہ دنیاوی معاملات کی تدبیر کے ساتھ ساتھ دینی اقدار اور شریعت کی حفاظت و پاسبانی ہے۔ اس کلاسیکی فلسفہِ سیاست کی جامع ترین تعریف امام ماوردی نے اپنی مشہور تصنیف 'الاحکام السلطانیہ' میں ان الفاظ میں بیان کی ہے " الْإِمَامَةُ مَوْضُوعَةٌ لِخِلَافَةِ النُّبُوَّةِ فِي حِرَاسَةِ الدِّينِ وَسِيَاسَةِ الدُّنْيَا (10) یعنی امامت یا سیاسی قیادت درحقیقت خلافتِ نبوت کا قائم مقام ہے، جس کا مقصد دین کی حفاظت اور دنیا کا سیاسی وانتظامی نظم و نسق چلانا ہے۔

پاکستان کی متبادل سیاسی و انتظامی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ معاشی اور سیاسی دونوں محاذوں پر ریاستی ڈھانچہ مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ استعماری دور (Colonial Era) کا مروجہ سیاسی وانتظامی ڈھانچہ اپنی بنیادی ساخت کے ساتھ برقرار رہا، جس کے نتیجے میں اقتدار اور ملکی وسائل پر بالادست طبقات کا اثر و رسوخ قائم رہا اور عوامی طبقات ترقی کے ثمرات سے محروم رہے۔

۱۹۷۹ء میں جب 'حدود آرڈیننس' نافذ کیا گیا، تو ملک کے لبرل اور سیکولر طبقات کی جانب سے ان قوانین کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس فکری مہم میں جہاں مقامی میڈیا نیٹ ورکس نے حصہ لیا، وہاں بین الاقوامی سطح پر مغربی ممالک اور امریکی سفارت خانوں کی سفارتی مداخلت اور دباؤ کے مآخذ بھی ریکارڈ پر موجود ہیں، جو ان قوانین کی منسوخی یا ان میں ترامیم کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔(11)

معاشرتی نظام کو اسلامی اقدار کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں بھی مسلسل فکری و ساختی تضادات کا شکار رہی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی بتیس سالوں تک تعزیراتِ پاکستان میں اخلاقی جرائم کے حوالے سے روایتی نوآبادیاتی قوانین ہی رائج رہے اور ان کے خلاف جامع اسلامی قانون سازی موجود نہیں تھی۔(12) ۱۹۷۹ء میں جب 'حدود آرڈیننس' نافذ کیا گیا، تو ملک کے لبرل اور سیکولر طبقات کی جانب سے ان قوانین کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس فکری مہم میں جہاں مقامی میڈیا نیٹ ورکس نے حصہ لیا، وہاں بین الاقوامی سطح پر مغربی ممالک اور امریکی سفارت خانوں کی سفارتی

مداخلت اور دباؤ کے مآخذ بھی ریکارڈ پر موجود ہیں، جو ان قوانین کی منسوخی یا ان میں ترامیم کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔(13)

معاصر منظر نامے میں ناموسِ رسالت اور قادیانیت سے متعلق آئینی و قانونی دفعات کو بھی اسی نوعیت کی تنقید کا سامنا ہے۔ لبرل حلقوں کی جانب سے چلائی جانے والی اس مہم میں بعض اوقات مقتدر حلقوں اور پارلیمنٹ کے اراکین کی بالواسطہ یا بلاواسطہ شمولیت پر اکیڈمک سطح پر آئینی خیانت کے حوالے سے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے عوامی بیانیے اور داخلی پالیسیوں میں یہ تضاد نمایاں نظر آتا ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر ان قوانین کی افادیت کو چیلنج کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بحث جمہوری اصولوں کے بھی بر عکس محسوس ہوتی ہے، جہاں قوانین کی تشکیل بنیادی طور پر اکثریت کی رائے اور عمرانی معاہدے (Social Contract) کے تحت عمل میں آتی ہے۔ سب سے اہم دستوری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نصوصِ شریعت کو مآخذ ماننے کے بعد، کوئی بھی 'اسلامی جمہوریہ' ان اصولوں سے انحراف کا قانونی مجاز ہو سکتا ہے یا نہیں؟

خواتین کے حقوق اور صنفی قانون سازی (Gender-based Legislation) کا شعبہ بھی روایتی مذہبی فکر اور جدید ریاستی اقدامات کے مابین فکری تصادم کی ایک نمایاں مثال ہے۔ مسلم عائلی قوانین آرڈیننس ۱۹۶۱ء (Muslim Family Laws Ordinance) کی بعض شقوں پر جید علماء کے شدید تحفظات کے باوجود اسے نافذ کیا گیا۔ ان قوانین میں دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی یا ثالثی کونسل سے تحریری اجازت کی شرط عملاً پیچیدہ سماجی مسائل کا سبب بن رہی ہے، جس کے باعث خواتین کو بسا اوقات گھریلو تشدد یا طلاق جیسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح کے فکری تحفظات کا سامنا ۲۰۱۶ء کے 'تحفظِ نسواں بل (Protection of Women against Violence Act)' کو بھی کرنا پڑا۔ ریاستی کارپردازوں کی جانب سے شریعت کے جامع تصورِ عدل پر تکیہ کرنے کے بجائے اقوامِ متحدہ اور بیجنگ کانفرنسز (Beijing Conferences) کے بین الاقوامی ایجنڈوں کے مطابق کی جانے والی قانون سازی اکثر مقامی معاشرتی حقائق سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث مسائل میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ جب مذہبی حلقے ان قوانین پر علمی اعتراضات اٹھاتے ہیں، تو سیکولر بیانیے میں اسے "اسلام کے صنفی امتیاز" سے تعبیر کر کے لبرل افکار کے ترویج کے لیے ماحول سازگار بنایا جاتا ہے۔ اس کا ایک واضح مظہر ۲۰۱۸ء کے عالمی یومِ خواتین (International Women's Day) کے موقع پر سامنے آیا، جہاں روایتی سماجی و اخلاقی اقدار کے بر عکس نعروں اور پلے کارڈز پر مبنی جلوسوں نے پاکستانی معاشرے کے روایتی اور سنجیدہ حلقوں میں شدید فکری اضطراب پیدا کیا۔

دستورِ پاکستان ۱۹۷۳ء کے رہنما اصولوں (Principles of Policy) میں یہ واضح شق موجود ہے کہ "ریاست اسلامی روایات کے فروغ کے لیے کوشاں ہوگی"، تاہم اس کی پامالی متعدد مقامات پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اب تک ذرائع ابلاغ کے لیے ایسے جامع رہنما اصول متعین نہیں کیے جا سکے جو ان کی اخلاقی حدود کار کا تعین کر سکیں، بالخصوص فحاشی اور عریانی کی قانونی تعریف مبہم ہونے کے باعث نجی ٹی وی چینلز کسی سخت ضابطے کے پابند دکھائی نہیں دیتے۔(14)

یہ ابلاغی نظام سیکولر افکار کی ترویج کا ایک مؤثر ذریعہ بن چکا ہے، جہاں ٹاک شوز اور لائیو مباحثوں میں پاکستان کی اسلامی شناخت، قراردادِ مقاصد اور آئین کی اسلامی دفعات کو مسلسل تشکیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان پروگراموں میں سیکولر دانشوروں کو بطورِ خاص مدعو کیا جاتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی نظریاتی یا جمہوری ریاست میں اس کے اساسی قومی بیانیے (Meta-narrative) کو اس نوعیت کے منظم ابلاغی چیلنجز کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

تعلیمی نظام کے ذریعے سیکولر افکار کا نفوذ

عالمی سطح پر تعلیمی پالیسیوں کی تشکیل قومی اور حکومتی سطح پر کی جاتی ہے، کیونکہ کسی بھی ریاست کے اساسی نظریے کی ترویج، ثقافتی ورثے کی حفاظت اور تمدنی ترقی ایک مربوط نظامِ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔(15) قیامِ پاکستان سے قبل بھی برصغیر کے مسلمان مختلف فکری و تعلیمی تجربات (مثلاً علی گڑھ، دیوبند، ندوہ اور جامعہ ملیہ) سے گزر رہے تھے۔ تعلیم کی اسی سٹرکچرل اہمیت کے پیشِ نظر، آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹Rott ء کے اجلاس میں ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا ایک بنیادی فریضہ مستقبل کی مملکت کے لیے تعلیمی نظام کا خاکہ مرتب کرنا تھا۔ دستورِ پاکستان ۱۹۷۳ء کے رہنما اصولوں (Principles of Policy) میں بھی تعلیمی نظام کی نظریاتی جہت کا واضح تعین کیا گیا ہے۔ دستوری دفعات کے مطابق، ریاست پاکستان کے مسلم شہریوں کے لیے ایسے اقدامات اور سہولیات فراہم کرنے کی پابند ہے جن کے ذریعے وہ قرآن و سنت کی روشنی میں زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں، اور حکومت کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ وہ قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی بنائے گا۔(16)

ان دستوری اصولوں کے تحت اسلامیات کو لازمی تو کیا گیا، تاہم نصاب میں اس کا حجم اور گہرائی انتہائی محدود رکھی گئی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اواخر میں ترجمہِ قرآن مجید کو باقاعدہ نصاب کا حصہ بنانے کی کوششیں شروع ہوئیں، لیکن مختلف بااثر لبرل لابیوں اور فکری حلقوں کے تحفظات کے باعث یہ اقدامات مستقل بنیادوں پر نافذ نہ ہو سکے۔ بعد ازاں، تفہیمِ قرآن کے لیے عربی زبان کو لازمی قرار دینے کی قانون سازی کی گئی، تاہم اس لازمی حیثیت کو عدالتی چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا اور پنجاب حکومت کی اپیل پر اعلیٰ عدلیہ کے فیصلے کے ذریعے اس کی لازمی قانونی حیثیت کو ختم کر دیا گیا۔(17)

دوسری طرف، دستوری روح کے مطابق جس جامع تعلیمی اصلاحات کی ضرورت تھی، وہ مروجہ نظام میں نافذ نہ ہو سکیں، جس کے نتیجے میں ملک کا تعلیمی ڈھانچہ گہرے طبقاتی تضادات کا شکار ہو گیا۔ معاصر تعلیمی سروے اور رپورٹس کے مطابق، شہری مراکز میں طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد نجی تعلیمی اداروں (Private Sector) سے رجوع کر رہی ہے۔(18) مشنری اسکولز، گرامر اسکولز اور غیر ملکی امتحانی بورڈز (مثلاً او اور اے لیول) کے تحت چلنے والے مہنگے نجی اداروں کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم ہو چکا ہے، جن میں سے بعض ادارے بین الاقوامی فنڈنگ اور غیر ملکی ترقیاتی گرانٹس کے تعاون سے کام کر رہے ہیں۔ اسکولوں سے لے کر جامعات تک پھیلا ہوا یہ نجی شعبہ ملکی سیاست، معیشت اور انتظامیہ کو بیوروکریسی اور قیادت فراہم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن اپنے نصابی مواد اور ڈھانچے کے باعث یہ ادارے عملاً سیکولر افکار کے بنیادی مراکز بن چکے ہیں۔

ان اداروں کا نصابِ تعلیم زیادہ تر درآمد شدہ یا بین الاقوامی پبلشرز کا تیار کردہ ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اسلامیات کی کتب بھی اسی فریم ورک کے تحت تیار کی جاتی ہیں۔ ان کتب میں بعض اوقات جیو پولیٹیکل تضادات (جیسے پاکستان کے نقشے اور مسئلہ کشمیر کے حوالے سے غلطیاں) اور مسلم تاریخ کے بارے میں فکری تشکیک پیدا کرنے والے مباحث شامل ہوتے ہیں۔ ان میں پیش کردہ سماجی منظر نامہ، طرزِ زندگی، لباس، اور ثقافتی سرگرمیاں زیادہ تر مغربی معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس تعلیمی ماحول سے فارغ التحصیل ہونے والے نوجوانوں کے لیے روایتی پاکستانی معاشرہ اور دینی اقدار اجنبی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ نصاب کے ساتھ ساتھ ان اداروں کا داخلی ماحول، اساتذہ کا طرزِ عمل، اور جدید ثقافتی تقریبات روایتی اخلاقی اقدار کو مسلسل چیلنج کرتی ہیں۔ ان اداروں میں فکری آزادی اور 'بے باکی' (Boldness) کو اکیڈمک اقدار کے طور پر سراہا جاتا ہے، جس کا اظہار بعض نجی جامعات میں طلبہ کی جانب سے کی جانے والی متنازع سماجی مہمات اور نمائشوں کی صورت میں بھی سامنے آیا، جنہیں بین الاقوامی میڈیا نے بھی کور کیا۔(19) مزید برآں، ان اداروں کے طلبہ کو بین الاقوامی تعلیمی وظائف (Foreign Scholarships) اور اسٹوڈنٹ ایکسچینج پروگرامز (Student Exchange Programs) تک آسان رسائی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم، ان پروگراموں کے سیکیورٹی اور نفسیاتی خطرات بھی موجود ہیں، جیسا کہ ماضی میں امریکی اسکول فائرنگ کے واقعے میں ایک پاکستانی ایکسچینج طالبہ کی ہلاکت سے واضح ہوا۔(20) اس نظام کا ایک بڑا منفی پہلو یہ بھی ہے کہ ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کی اکثریت اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ زندگی کے لیے مستقل طور پر بیرونِ ملک ہجرت کو ترجیح دیتی ہے، جو ملک میں 'برین ڈرین (Brain Drain)' اور فکری دوری کا سبب بن رہا ہے۔

تعلیمی و سماجی رجحانات کے نتیجے میں نوجوان نسل کے ایک حصے میں روایتی اسلامی نصب العین، حب الوطنی، نظریہ پاکستان اور مثالی اسلامی معاشی و سیاسی نظام جیسے بنیادی بیانیوں (Narratives) کے متبادل ایک نئی سوچ جنم

لے رہی ہے۔اس فکری تبدیلی کے زیرِ اثر، روایتی عقائد اور عبادات کے تقابل میں سیکولرازم کو زندگی کے معاصر مسائل کا حقیقی اور عملی حل بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ سوشل میڈیا نیٹ ورکس پر اس فکر کے حامل منظم گروپس متحرک ہیں، جو مستقل بنیادوں پر ڈیجیٹل اور فزیکل فورمز کا انعقاد کر رہے ہیں۔ اسکولوں، کالجوں اور مقامی سطح پر اس بیانیے کی ترویج کی جارہی ہے کہ معاصر سماج میں سیکولر افکار کے پھیلاؤ کو روکنا اب ممکن نہیں رہا۔ بعض بین الاقوامی مشنری ادارے اور نجی تعلیمی نیٹ ورکس باہمی تعاون سے مسلم طلبہ کے لیے "رواداری (Tolerance) "اور تکثیریت جیسے موضوعات پر سیمینارز منعقد کروارہے ہیں، جبکہ بعض نجی و سرکاری جامعات کے اساتذہ بھی اپنے اکیڈمک لیکچرز کے دوران ان لبرل افکار کو فروغ دے رہے ہیں۔(21)اس منظم فکری لہر کے باوجود، ملکی پالیسی سازوں اور اعلیٰ انتظامی سطح پر اس رجحان کے طویل المیعاد اثرات کے حوالے سے کوئی جامع حکمتِ عملی نظر نہیں آتی۔

اگر اس فکری پھیلاؤ کے مادی حجم کا اندازہ لگایا جائے، تو پاکستان میں کام کرنے والے صرف ایک بڑے نجی اسکول چین (Elite School Chain) کی آفیشل ویب سائٹ کے مطابق ان کے پاس زیرِ تعلیم طلبہ و طالبات کی تعداد تقریباً ڈھائی سے پونے تین لاکھ ہے۔ ان اداروں کا نیٹ ورک ملکی اشرافیہ اور مقتدر حلقوں کی اگلی نسل تیار کر رہا ہے۔اس بیانیے کے عملی مظاہر اس وقت سامنے آئے جب معاصر ماضی میں سوشل میڈیا پر متنازع مواد شیئر کرنے والے بلاگرز (Bloggers) کا معاملہ منظرِ عام پر آیا، جنہیں بین الاقوامی انسانی حقوق کے اداروں اور مغربی حکومتوں کی جانب سے وسیع سفارتی و عوامی حمایت حاصل ہوئی، جس کے دباؤ کے تحت ریاستی اداروں کو ان کے خلاف قانونی کارروائی میں لچک دکھانی پڑی۔(22)

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان میں سے بعض متحرک افراد انہی نجی تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل تھے۔ یہ صورتِ حال یہ واضح کرتی ہے کہ یہ رجحانات محض انفرادی رویے نہیں، بلکہ قومی سطح پر سیکولرائزیشن (Secularization) کی ایک وسیع اور منظم مہم کا حصہ ہیں؛اور اگر موجودہ فکری و تعلیمی منظر نامے کا اکیڈمک سطح پر ادراک کر کے سٹرکچرل اصلاحات نہ کی گئیں، تو آئندہ ایک دہائی میں اس کے پاکستانی معاشرت اور قومی یکجہتی پر گہرے فکری و سماجی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

سیکولرائزیشن کے اثرات اور روایتی مذہبی قیادت کا کردار

پاکستان میں دینی اقدار کے تحفظ، شعائرِ اسلام کی ترویج اور عوامی سطح پر عبادات و اخلاقیات کی تعلیم و تذکیر میں دینی مدارس اور روایتی مذہبی قیادت (علماء) کا کردار نہایت نمایاں رہا ہے۔ یہ اعتراف بھی اکیڈمک سطح پر ناگزیر ہے کہ دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں میں مروجہ مذہبی تحریکوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں، جن میں سے بعض تنظیمیں

معاصر دور میں فلاحِ عامہ اور سماجی خدمات (Social Services) کے میدان میں بھی ملکی سطح پر نمایاں ہو کر ابھری ہیں۔ ان تمام دینی و سماجی تحریکوں کو افرادی قوت (Human Resource) بنیادی طور پر مساجد اور مدارس کے نیٹ ورک ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ تاہم، ان روایتی خدمات کے اعتراف کے ساتھ، معاشرتی و تعلیمی عمرانیات (Sociology of Religion) کے تناظر میں یہ ایک اہم فکری چیلنج بھی ہے کہ پاکستان میں سیکولر افکار کے فروغ اور نفاذ کے اسباب میں روایتی مذہبی طبقات کے اپنے طرزِ عمل اور طریقہِ کار کا بھی گہرا دخل رہا ہے۔

اگرچہ اسلامی تعلیمات کے مطابق امر بالمعروف اور دعوت و تبلیغ کی بنیادی ذمہ داری امت کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے، جیسا کہ خطبہ حجتہ الوداع کی مشہور روایت میں صراحت ہے کہ " فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ " حاضر کو چاہیے کہ وہ غائب تک (میرا پیغام) پہنچادے"(23)، تاہم اس فکری و عملی محاذ پر اہلِ علم اور اساتذہ کی ذمہ داریاں ایک عام شہری سے کہیں زیادہ ہیں۔ نبوی ارشادات کے مطابق: إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے(24)، جو معاشرے کی فکری، اخلاقی اور قانونی رہنمائی کے سٹرکچرل ذمہ دار ہیں۔ اگر علومِ نبوت کے یہ حاملین عصری تقاضوں، جدید سیاسی و معاشی تھیوریز (Modern Socio-Economic Theories) اور بدلتے ہوئے تمدنی رجحانات کے مطابق اپنی ذمہ داریاں کماحقہ ادا کرتے، تو شاید سیکولر افکار کو معاشرے کے مقتدر تعلیمی اور انتظامی حصوں میں اس قدر نفوذ حاصل نہ ہوتا۔ روایتی مذہبی فکر کے حامل ان طبقات کی سٹرکچرل اور فکری کوتاہیوں کے چند ایسے نمایاں پہلو، جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر معاشرے میں سیکولرائزیشن (Secularization) کے فروغ کا سبب بنے، گہرے علمی تجزیئے کے تقاضا کرتے ہیں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے فکری تناظر میں پاکستان کے نوجوانوں میں سیکولر رجحانات کا ابھار محض ایک انفرادی گمراہی نہیں، بلکہ استعماری و ثنائی نظامِ تعلیم (Dual Educational System) اور آزادی کے بعد ریاستی پالیسی سازوں کی منافقت کا منطقی نتیجہ ہے، جس نے کائنات اور معاشرے کا تصور بغیر خدا کے پڑھا کر نئی نسل کو "ذہنی ارتداد" کا شکار کیا۔ ان کے نزدیک اس بحران کو گہرا کرنے میں روایتی مذہبی قیادت کا فکری جمود بھی برابر کا ذمہ دار ہے، جس نے دین کو محض چند فقہی جزئیات تک محدود کر کے معاصر لادینی فلسفوں کا متبادل اور جدید اسلامی فلاحی نظام پیش کرنے کے بجائے اجتہاد کا راستہ روکا۔ سوشل میڈیا اور این جی اوز کے ذریعے مڈل کلاس میں پھیلنے والی لبرل سرگرمیوں کو وہ ایک منظم فکری جنگ (Ideological Warfare) قرار دیتے ہیں، جس کے سماجی اثرات خاندانی نظام کی تباہی، اخلاقی انحطاط اور بالآخر پاکستان کی نظریاتی موت کی صورت میں نکل رہے ہیں۔ سید مودودیؒ کے مطابق اس کا تدارک محض فتووں یا طاقت سے ممکن نہیں، بلکہ اس کا حل پورے نظامِ تعلیم کی توحیدی بنیادوں پر اصلاح، اسلام کے جامع نظامِ

حیات کو عصری اکیڈمک زبان میں پیش کرنے اور مسجد کے ادارے کو ایک انقلابی تربیتی و سماجی مرکز (Community Center) میں ڈھالنے میں پنہاں ہے۔(25)

معاصر علمائے کرام اور مفکرین کی آراء کا نچوڑ یہ ہے کہ پاکستانی نوجوانوں میں سیکولر رجحانات کا فروغ محض ایک فکری فیشن نہیں، بلکہ ایک گہرا ساختی بحران ہے۔ مفتی تقی عثمانی کے نزدیک اس کا حل سودی و مادی نظام کے مقابلے میں اسلام کا عملی و معاشی متبادل پیش کرنا اور نصاب کی اصلاح ہے؛ جب کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی فکر کے تحت یہ مغربی استعمار کی منظم فکری یلغار ہے جس کا سدِ باب قرآنِ کریم کے آفاقی پیغام کو عام کرنے اور اسلام کو بطورِ نظامِ حیات عملاً نافذ کرنے میں پنہاں ہے۔

معاصر پاکستانی تناظر میں نوجوان نسل کے اندر بڑھتے ہوئے لادینی رویوں پر پروفیسر طارق جان کی فکری کاوش "سیکولرازم: مباحث اور مغالطے "ایک کلیدی علمی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ طارق جان اس مغالطے کا سائنسی رد کرتے ہیں کہ سیکولرازم محض ایک غیر جانبدارانہ سیاسی نظام یا مذہب گریزی کا نام ہے؛ بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک متبادل مادی الٰہیات (Alternative Materialistic Theology) ہے جو انسانی زندگی سے وحی کی رہنمائی کو یکسر خارج کر دیتی ہے۔ وہ پاکستان میں نوجوانوں کی فکری بیگانگی کا سب سے بڑا سبب ملکی تعلیمی نظام اور ابلاغی وسائل (Media) پر مغربی فکر کی بالادستی کو قرار دیتے ہیں، جو نئی نسل کو یہ باور کرانے میں مصروف ہیں کہ اسلام معاصر دنیا کے پیچیدہ تمدنی، معاشی اور قانونی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ طارق جان کے تجزیے کے مطابق، اس لادینی فکر کے سماجی اثرات پاکستانی معاشرے کے خاندانی ڈھانچے کی شکست و ریخت، حیاء کے نظام کی کمزوری اور نظریاتی شناخت کے زوال کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں؛ جس کا واحد تدارک یہ ہے کہ معاصر الحادی ابحاث کا جذباتی فتووں کے بجائے محققانہ اور سائنسی انداز میں علمی تعاقب کیا جائے۔(26)

روایتی مذہبی فکر کے معاصر فکری وساختی چیلنجز

(الف)جدید عصری افکار کا فکری متبادل فراہم کرنے میں ناکامی

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور ہی سے یہ علمی حقیقت واضح تھی کہ بین الاقوامی سطح پر ابھرنے والے جدید معاشی و سیاسی فلسفوں اور فکری رجحانات (مثلاً سرمایہ داری، اشتراکیت، قوم پرستی اور لبرل جمہوریت) کے اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنا ایک فکری چیلنج ہو گا۔ اس تناظر میں ضرورت اس امر کی تھی کہ دین اور شریعت کی بنیادی تعلیمات کو ان کی لایقِ فہم حکمتوں، معاصر اسلوبِ بیان اور جدید علمی اصطلاحات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا جاتا تاکہ نسلِ نو کے فکری سوالات کا سائنسی جواب دیا جا سکتا۔ ماضی میں پاکستان کے علمی و سیاسی منظر نامے پر کمیونزم (Communism)

کے گہرے اثرات اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ تاہم، روایتی مذہبی قیادت کی جانب سے ان فکری چیلنجز کا علمی و تحقیقی سدِ باب متبادل ڈسکورس کی شکل میں بہت کم نظر آیا۔ اس کے برعکس، جب تاریخ میں قدیم وجدید دونوں علوم پر دسترس رکھنے والے چند مصلحین اور مفکرین نے اس فکری خلا کو پُر کرنے کی علمی کوشش کی، تو روایتی مذہبی حلقوں کی جانب سے ان کی شدید مخالفت کی گئی، اور تعمیری تنقید کے بجائے تکفیر، تضحیک اور ذاتی الزامات کا سہارا لیا گیا، جس کے نتیجے میں نوجوان نسل کا ایک بڑا حصہ روایتی مذہبی ڈھانچے سے مزید دور ہو گیا۔

(ب) مسلکی عصبیت اور نصابی ڈھانچہ

دوسرا کلیدی پہلو مروجہ مسلکی عصبیتوں (Sectarian Prejudices) کا تسلسل ہے۔ مدارسِ دینیہ کے داخلی اور تعلیمی نظام کا معروضی جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان مسلکی تفریقات کی فکری بنیادیں خود ان کے مروجہ نصابی ڈھانچے (Curriculum Unit) کے اندر موجود ہیں۔ قرآن وحدیث اور سیرت وتاریخ کی تفہیم بسا اوقات وسیع تر آفاقی تناظر کے بجائے مخصوص فقہی یا مسلکی زاویوں کے تحت کروائی جاتی ہے۔ اس تعلیمی ماحول سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد میں یہ عصبیتیں فکری سطح پر راسخ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مساجد کے منبر و محراب اور جمعہ و عیدین کے خطبات میں یہ مسلکی رنگ کثرت سے نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ معاصر شہری آبادیاں مشترکہ سماجی ساخت پر مبنی ہیں، اس لیے عوامی مجالس اور مساجد میں اس نوعیت کی مخصوص فقہی و مسلکی ابحاث عام شہریوں بالخصوص سنجیدہ اور پڑھے لکھے طبقے کی دلچسپی کو ختم کر دیتی ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرے کا ایک بڑا حصہ مساجد اور روایتی دینی تذکیر کے مواصلاتی دائرے سے دور ہو کر جدید لادینی و سیکولر افکار کے لیے ایک آسان ہدف بن گیا ہے۔

(ج) ابلاغِ دین میں مبالغہ آرائی اور علمی سطحیت

تیسرا اہم ساختی معاملہ فہمِ دین اور تفہیمِ شریعت کے بنیادی مقاصد سے دوری ہے۔ معاصر مذہبی خطابت میں معروضی تدریس کے بجائے اثر آفرینی اور جوشِ خطابت پر زیادہ انحصار کیا جاتا ہے، حالانکہ نبوی تعلیمات میں بناوٹ اور مبالغہ آمیز اسلوبِ بیان کو ناپسند فرمایا گیا ہے۔إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يُبْغِضُ الْبَلِيغَ مِنَ الرِّجَالِ الَّذِي يَتَخَلَّلُ بِلِسَانِهِ تَخَلُّلَ الْبَاقِرَةِ بِلِسَانِهَا(27) قرآن وحدیث کی تشریح اور سیرتِ نبوی کے بیان میں تاریخی استناد کے بجائے بسا اوقات خطیبانہ مبالغہ آرائی اور جذباتی اسلوب اس حد تک غالب آ جاتا ہے کہ عامۃ الناس ان علمی بیانات کو محض ایک روایتی داستان کے طور پر سنتے ہیں اور انہیں عصری زندگی میں قابلِ عمل لائحہ عمل نہیں سمجھتے۔ موجودہ معاشی و معاشرتی دباؤ، نفسیاتی امراض اور ڈیپریشن (Depression) کے دور میں ضرورت اس بات کی تھی کہ:

- عقائدِ اسلام کو سادہ، عقلی اور فکری انداز میں سمجھایا جاتا جو دینی و اخلاقی زندگی کی اساس ہیں۔

- اسوۂ حسنہ کو ایک عملی نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا جس میں سادگی، حسنِ بندگی اور حسنِ معاشرت کے ذریعے عام شہری کی سماجی زندگی کے لیے رہنمائی موجود ہو۔
- عبادات کی عمرانی و اخلاقی حکمتیں واضح کی جاتیں اور معاصر مادی فلسفوں کے تقابل میں ان کی سہولیات اور رخصتوں کو اجاگر کیا جاتا تاکہ نئی نسل دینی اقدار پر جھجک کے بجائے فخر محسوس کر سکے۔

(د) نازک ابحاث کا عوامی سطح پر ابلاغ:

چوتھا اہم پہلو اس نبوی حکمتِ عملی سے انحراف ہے جس میں ہدایت دی گئی تھی کہ حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، "لوگوں سے ان کے فکری معیار اور معلوم مفہوم کے مطابق گفتگو کرو"۔ (28) اس اصول کے برعکس، پیچیدہ، لاحاصل اور فکری ابحاث کو عوامی سطح پر لایا گیا ہے، جس کے باعث عام پبلک اپنی کم علمی کے سبب مزید تضادات کا شکار ہو رہی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا، ٹاک شوز اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر نہایت حساس دینی اور قانونی مسائل پر غیر محتاط اور سطحی گفتگو کی جاتی ہے، جو معاشرے میں فکری انتشار کا سبب بنتی ہے۔

(ھ) سیاسی مصلحت پسندی اور تفاخرِ دنیا:

سب سے اہم سبب روایتی مذہبی طبقات کی سیاسی مصلحت پسندی اور مقتدر حلقوں کے ساتھ وابستگی ہے۔ بعض نامور مذہبی شخصیات کی جانب سے سیاسی مناصب اور حکومتی عہدوں کی حرص میں جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا گیا، اس نے مخلص اور بے لوث اہلِ دین کی ساکھ کو بھی شدید متاثر کیا۔ اس طرزِ عمل نے عوامی سطح پر یہ منفی تاثر قائم کیا کہ مذہبی مقتدرہ تفاخرِ دنیا اور مادی مفادات کے حصول میں مروجہ دنیادار طبقات ہی کا تسلسل ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ عمومی بیانیہ جڑ پکڑ گیا کہ روایتی مذہبی قیادت معاصر دنیاوی معاملات، ملکی نظم و نسق اور جدید ریاستی انتظام کو چلانے کی فکری و عملی صلاحیت سے محروم ہے، اور اسی تاثر نے معاشرے میں سیکولرائزیشن اور لادینی افکار کے نفوذ کے لیے ایک وسیع فکری جواز فراہم کیا۔

خلاصہ بحث

پاکستانی معاشرے میں، جہاں چھیانوے فیصد سے زائد مسلم اکثریت آباد ہے، نوجوان نسل میں سیکولر اور الحادی رجحانات کا بڑھنا محض ایک سطحی تبدیلی نہیں بلکہ ایک تشویشناک فکری اور سماجی بحران ہے، جو اب صرف بالائی طبقے تک محدود نہیں رہا بلکہ مڈل کلاس کے نوجوانوں میں بھی تیزی سے سرایت کر رہا ہے۔ اس بحران کے تین بنیادی اسباب ہیں؛ پہلا یہ کہ ریاستی و حکومتی سطح پر اسلام کے عملی نظامِ حیات کو نافذ کرنے میں سستی دکھائی گئی، دوسرا یہ کہ حکومت نے ان تعلیمی اداروں کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے جہاں فکری تربیت کے فقدان کے باعث نئی نسل میں دین سے دوری پیدا ہو

رہی ہے، اور تیسرا سبب یہ کہ روایتی مذہبی قیادت اور اہلِ علم وقت کے ان معاصر چیلنجز کو بر وقت سمجھنے میں ناکام رہے۔ ان گمراہ کن افکار کے سماجی اثرات پاکستانی معاشرے کی روایتی اور خاندانی ساخت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں کیونکہ یہ نئی نسل کو ان کی مذہبی شناخت سے دور کر کے فکری انتشار کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

اس صورتحال کے سدِباب اور معاشرے میں اسلامی اقدار کے دوبارہ احیاء کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے جدید علوم کے ماہرین اور علماء پر مشتمل ایک مضبوط تھنک ٹینک بنایا جائے جو الحادی مغالطوں کا علمی جواب دے اور حکومت پر مثبت نفاذ کے لیے دباؤ ڈالے، دوسرے نمبر پر میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے نوجوانوں کو ان نظریات کے خطرات سے آسان زبان میں باخبر کیا جائے؛ تیسرے مرحلے میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور علمائے کرام مشترکہ پلیٹ فارمز سے نوجوانوں کے جدید فکری و نفسیاتی مسائل کا علمی حل پیش کریں، اور سب سے مؤثر قدم کے طور پر مسجد کے ادارے کو محض عبادات تک محدود رکھنے کے بجائے مغربی دنیا کے مسلمانوں کے مثبت تجربات کی روشنی میں نکاح اور دیگر سماجی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر ایک متحرک "کمیونٹی سینٹر" میں تبدیل کیا جائے تاکہ نئی نسل کی مسجد سے دوری ختم ہو سکے، ان شاءاللہ۔

اس صورتحال کو بدلنے کے لیے چند اہم اقدامات کی ضرورت ہے:

- سب سے پہلے، زندگی کے ہر شعبے کے ماہرین اور علماء کو ملا کر ایک مضبوط تھنک ٹینک بنایا جائے جو الحادی سوچ کا علمی جواب بھی دے اور حکومت پر اچھے کاموں کے لیے دباؤ بھی ڈالے۔
- میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعے عام لوگوں اور نوجوانوں کو ان گمراہ کن نظریات کے خطرات سے صاف اور آسان زبان میں آگاہ کیا جائے۔
- یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور علمائے کرام مل کر ایسے پروگرامز کریں جہاں نوجوانوں کے نئے مسائل پر کھل کر بات ہو۔
- سب سے بڑھ کر، مسجد کے ادارے کو صرف نماز تک محدود رکھنے کے بجائے محلے کی سماجی سرگرمیوں، نکاح کی تقریبات اور اہم فیصلوں کا مرکز بنایا جائے——بالکل ویسے ہی جیسے مغرب میں مسلمانوں نے کامیاب کمیونٹی سینٹرز بنا کر اپنی نئی نسل کو دین سے جوڑے رکھا ہے۔ ان شاء اللہ، ان کوششوں سے نوجوانوں کی مسجد سے دوری ختم ہوگی اور معاشرے میں اسلامی اقدار دوبارہ زندہ ہوں گی۔

* * * * * * *

(1) القرآن الکریم.(سورۃ البقرۃ،208).
(2) Collins English Dictionary. (2026). Secularism. Retrieved May 23, 2026, from Collins English Dictionary.
(3) Lipka, M. (2017, May 26). Muslims and Islam: Key findings in the U.S. and around the world. Pew Research Center.
(4) Khan, A. (2024, May 15). The future of secular discourse. The Nation.
(5) Apple, M. W. (2000). Official knowledge: Democratic education in a conservative age (pp. 34–36). Routledge.
(6) Oxford English Dictionary. (2026). Skepticism. Retrieved May 23, 2026, from https://www.oxforddictionaries.com/definition/skepticism
(7) اقبال، محمد. (2021). مقالاتِ اقبال (ڈاکٹر محمد رفیق افضل، مرتب؛ ص160–162). لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔
(8) جناح، محمد علی۔ (1989). قائدِ اعظم محمد علی جناح: تقاریر و بیانات (ج 4، ص 24–26). اسلام آباد: وزارتِ اطلاعات و نشریات، حکومتِ پاکستان۔
9. Jinnah, M. A. (2004). Speeches as Governor-General of Pakistan, 1947–1948 (pp. 154–156). Sang-e-Meel Publications.
(10) الماوردی، أبوالحسن علي بن محمد. (2006). الأحكام السلطانية والولايات الدينية (ص15). القاهرة: دارالحديث.
(11) Mehdi, R. (1994). The Islamization of law in Pakistan (pp. 134–140). Routledge.
(12) Lau, M. (2006). The role of Islam in the legal system of Pakistan (pp. 88–92). Martinus Nijhoff Publishers.
(13) Mehdi, R. (1994). The Islamization of law in Pakistan (pp. 134–140). Routledge.
(14) Human Rights Watch. (2006). Pakistan: The Hudood Ordinances. Human Rights Watch.
(15) UNESCO. (2015). Rethinking education: Towards a global common good? UNESCO.
(16) Government of Pakistan. (1973). The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan (Art. 31, Chapter 1: Principles of Policy).
(17) Government of Punjab. (2018). Punjab Compulsory Teaching of the Holy Quran Act, 2018. Lahore High Court. (2021–2022). Judgments regarding the status of Arabic as a compulsory subject.
(18) Institute of Social and Policy Sciences. (2022). Public-private partnerships in education: Pakistan's experience (pp. 18–22). I-SAPS.
. Pakistan Bureau of Statistics. (2020). Pakistan Social and Living Standards Measurement (PSLM) Survey.
(19) Student activism and controversial awareness campaigns in private universities. (2016, March 18). Dawn. https://www.dawn.com/news/
(20) BBC News. (2018, May 19). Texas school shooting: Pakistani exchange student Sabika Sheikh among victims. https://www.bbc.com/news/world-asia-44181977
(21) Hoodbhoy, P. (1998). Education and the state: Fifty years of Pakistan (pp. 142–145). Oxford University Press.

(22) Amnesty International. (2017). Human rights in Pakistan: Annual report (pp. 54–58). Amnesty International.

(23)البخاري، محمد بن إسماعيل .(2002) . صحيح البخاري .بيروت: دار ابن كثير. كتاب العلم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم رب مبلغ أوعى من سامع (حديث رقم 67).

(24)الترمذي، محمد بن عيسى .(1975) .سنن الترمذي .القاهرة: مصطفى البابي الحلبي. كتاب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة (حديث رقم 2682).

(25)مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ .(2014) تنقیحات (ص 45–52). لاہور: اسلامک پبلیکیشنز۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ .(2018) تجدید واحیاءِ دین (ص 88–94). لاہور: اسلامک پبلیکیشنز۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ .(2011) تعلیمات (ص 112). لاہور: اسلامک پبلیکیشنز۔

(26) جان، طارق۔ .(2012) سیکولرازم: مباحث اور مغالطے (ص 74–85). اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز. (IPS)

(27) أبو داود، سليمان بن الأشعث السجستاني. (1421ھ) .سنن أبي داود .صيدا: المكتبة العصرية. كتاب الأدب، باب في التقعر في الكلام (حديث رقم 5005).

(28) البخاري، محمد بن إسماعيل .(2008) . صحيح البخاري .لاہور: شبیر برادرز. كتاب العلم، باب من خص بالعلم قوماً دون قوم كراهية أن لا يفهموا (حديث رقم 127).